© rasailojaraid.com

رُوداد ابتلاء: احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۲)

میجر محمد عبدالغفار ترک نے بر آمدے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ ایک ایسے شخص نے کھولا جس نے غیر فوجی لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ بیوقوفی اور سنگدلی کی علامات صاف جھلک رہی تھیں۔ اُس نے میجر کو فوجی انداز میں سلام کیا اور ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔

یہ جگہ ایک تنگ کوٹھڑی سی تھی۔ جیسے جیل کی کوٹھڑی ہوتی ہے۔ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے اُس کے بالمقابل ایک اور دروازہ تھا جو بہت ہی چھوٹا تھا اور مقفل تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے دانشمندوں کا یہ مقولہ یاد آیا کہ لا تدخلوا من الباب الضیق (تنگ دروازے سے کبھی داخل نہ ہو)۔ میں اب اس تنگ وقت میں اس طرح کی حکمتوں اور فلسفوں پہ کیا عملدرآمد کر سکتا ہوں۔ اندر ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی جس پہ گہرے گلابی رنگ کی پالش کی ہوئی تھی۔ لکڑی کے اندر متعدد نام کھدے ہوئے تھے جنہیں میں پڑھ نہ سکا۔ اس میز پہ دو یا تین رجسٹر پڑے تھے۔ اسی طرح کے رجسٹر جو بالعموم تھانوں کے اندر ہوتے ہیں۔ میز کے ایک پہلو میں سبز رنگ کا لوہے کا ایک بہت بڑا سیف رکھا ہوا تھا جس کا دستہ چمکدار تانبے کا تھا۔ مجھے وہم ہوا کہ شاید مجھے اسی سیف کے اندر قیامت تک کے لیے بند کر دیں گے —— اے کاش وہ ایسا کر دیتے —— میز کے پیچھے ایک چھوٹی سی چارپائی رکھی تھی جس پہ ایک قوی ہیکل انسان سویا ہوا زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ وہ اس قدر لمبا تھا کہ اُس کی پنڈلیاں چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ ہمارے داخل ہونے کے باوجود وہ نیند سے نہ اُٹھا وہ یوں نظر آتا تھا جیسے کسی ٹھوس اور سرد چٹان کا کوئی ٹکڑا رکھا ہوا ہو۔ میز کے سامنے ایک اور فوجی

© rasailojaraid.com

افسر بیٹھا ہوا تھا جس نے اپنا کوٹ قریب والی کرسی پر لٹکا رکھا تھا اور اُس کے کوٹ کے کندھوں پر تین ستارے اس بات کی علامت تھے کہ یہ کیپٹن کے عہدے کا افسر ہے۔ اُس نے میجر ترک کا استقبال کیا اور وہ دونوں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ اور میں گویا وہاں موجود ہی نہ تھا۔

میجر ترک اور اُس کے ساتھی جلدی واپس چلے گئے۔ اور میں اب نئے فوجی افسر کی تحویل میں تھا۔ اور اُس کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کسی توقف کے بغیر مجھ سے سوالات شروع کر دیے۔ پے در پے بڑی سُرعت کے ساتھ۔ تمہارا نام کیا ہے۔ تمہاری عمر کیا ہے۔ تمہارا پیشہ کیا ہے۔ تمہارا پتہ کیا ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی چیز ایسی ہے جسے یہاں بطور امانت رکھنا چاہتے ہو۔ پیٹی اتار دو۔ عینک بھی اتار دو ــــ میں نے اعتراض کیا کہ عینک تو میرے لیے بڑی ضروری ہے ــــ اُس وقت مجھے یہی محسوس ہوا کہ عینک میرے لیے بڑی ضروری ہے۔ وہ دیو ہیکل انسان جو چارپائی پر سو رہا تھا اور تھوڑی دیر پہلے بیدار ہو چکا تھا اُس نے گرجتی ہوئی آواز سے کہا، تمہارا فائدہ اِسی میں ہے کہ عینک اُتار دو۔

میں نے کہا، اس سے تمہارا کیا مطلب ؟

وہ بولا : اس دروازے کے اندر جو چیز تمہارا انتظار کر رہی ہے تم اُسے نہیں جانتے ؟

یہ سُن کر مجھ پر شدید مُردنی چھا گئی۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ عینک اُس کے حوالے کر دی ــــ کیا چیز میرا انتظار کر رہی ہے اور کیوں ؟ مجھے محمد علی پاشا اور ممالیک کا زمانہ یاد آگیا ــــ اسی قلعہ میں محمد علی پاشا کی کچہری لگتی تھی۔ وہ اپنی سفید داڑھی اور عقابی نگاہوں کے ساتھ یہاں بیٹھتا تھا۔ امین بک شاہین یاد آگیا ــــ میری ہر چیز جب کیپٹن اور اُس کے دیو ہیکل کارندے نے لے لی اور مجھے بالکل خالی ہاتھ کر دیا تو مجھے تیزی کے ساتھ تنگ دروازے کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی ایک ایسا منظر دکھائی دیا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور مجھے یقین ہے کہ میری زندگی کے آخری لمحات تک یہ منظر میرے ذہن سے محو نہ ہو گا۔

دروازے کے اندر میں نے قدم رکھا ہی تھا کہ اُسے فوراً بند کر دیا گیا۔ میرے قدموں نے محسوس کیا کہ آگے دو پتھر کی سیڑھیاں ہیں۔ میں سنبھلتے سنبھلتے اُن پر اُتر گیا۔ میں نے سامنے کھلی جگہ پر نظر دوڑائی۔ دھوپ داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں جن کے دروازے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھلے ہوئے تھے۔ ہر کوٹھڑی کی پیشانی پہ نمبر درج تھے۔ انسانوں کا ایک عجیب و غریب گروہ قطار اندر قطار رکھڑا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مجبور انسان قلعہ کی حوالات میں تشدد و تعذیب کی بھرپور رات گذارنے کے بعد اب بیت الخلا جانے کے لیے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ تیس یا چالیس آدمی ہوں گے۔ اُن میں سے ہر شخص درد سے کراہ رہا تھا۔ اُن پر جو وحشیانہ طریقے سے تشدد کیا گیا تھا اُس کی وجہ سے اُن کے چہرے مسخ ہو رہے تھے۔ ان میں سے دو آدمیوں نے ایک تیسرے شخص کو ہاتھوں پہ اُٹھا رکھا تھا جس کے دونوں پاؤں بُری طرح سوج رہے تھے۔ جسم کے مختلف حصوں کی پھٹی ہوئی کھال میں سے پیپ ٹپک رہی تھی، چہرہ بُری طرح سوجا ہوا تھا، اُسے جگہ جگہ سے نوچا گیا تھا اور اس کی وجہ سے بے شمار سُرخ اور نیلے نشان پڑے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے اس کے چہرے کے نقش و نگار واضح نہ ہو رہے تھے۔ یوں نظر آتا تھا جیسے اس انسان نے کوئی غلیظ اور بدنما لباس اوڑھ رکھا ہو تاکہ اس سے دوسروں کو خوفزدہ کیا جا سکے۔ ایک اور شخص نظر آیا۔ اُس کا سر بُری طرح پھٹا ہوا تھا اور سُرخ خون کی دھاریں اُس کے سیاہ بالوں میں سے گزر رہی تھیں۔ گویا تلوار کے ساتھ اُس کے سر میں چھید کیے گئے ہوں۔ ایک چوتھا انسان پیٹ کے بل رینگ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں پر اور دوسرے حصوں پر اس قدر شدید ضربیں لگ چکی تھیں کہ اُس سے چلا نہ جا رہا تھا۔ اُسے اُٹھانے والا بھی کوئی شخص نہ تھا۔ سب لوگ اُن افراد کو اُٹھا رہے تھے جن میں رینگنے کی سکت بھی نہ تھی۔ ——— یہ تھی وہ "معمولی مار" جس کے بارے میں پہرہ دار نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اور یہی وہ "معمولی مار" اس نئی دُنیا کے انجانے سفر میں میرا بشدت انتظار کر رہی تھی

میں چُپ چاپ کھڑا ان مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی ہولناکی کی وجہ سے میری زبان خشک ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بھی دلچسپ پہلو ہے کہ میرے اندر خوف باقی نہ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ حالات دیکھتے ہی میرے دل سے خوف زائل ہو گیا تھا۔ اور ابھی تک میں اس امر کی کوئی توجیہ نہیں کر سکا کہ کیوں خوف کی جگہ بے خوفی نے یکایک میرے دل میں گھر کر لیا۔ اچانک میرے سامنے ایک نوجوان آیا۔ گندمی رنگ کا۔ عمر تقریباً ٣٥ سال۔ اُس کی باریک باریک اوپر کو اُٹھی ہوئی مونچھیں جیسے نیا سوڈانی کوڑا جسے اب تک استعمال نہ کیا گیا ہو۔ یہ نوجوان کس طرف سے آیا۔ یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا۔ میں اس قطار کو دیکھنے میں منہمک تھا جو بیت الخلاء کے انتظار میں لگی ہوئی تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ نوجوان میری طرف بڑھا، بالکل میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اور گہری نظروں سے مجھے تاکنے لگا۔ گویا کہ وہ یہ مطالعہ کر رہا تھا کہ میرے ظاہر کے پیچھے میرا باطن کیسا ہے۔ میں بھی اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا: کیا تم احمد رائف ہو؟ ——— جی ہاں، میں احمد رائف ہوں۔ یہ جواب سنتے ہی اُس نے بجلی کی طرح اچانک میرے منہ پر زور سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ میری آنکھوں سے غصّے کے شرارے پھوٹنے لگے۔ پھر اس کے منہ سے موسلا دھار بارش کی طرح گالیاں برسنے لگیں۔ اور گالیوں کی ڈکشنری میں ——— اگر ایسی کوئی ڈکشنری دنیا میں موجود ہے ——— جو سب سے زیادہ غلیظ اور مبتذل گالیاں ہو سکتی تھیں وہ اس نے مجھے پیش کیں۔ میں نے بے شعوری کے عالم میں اُس کا گریبان پکڑ لیا اور اعصابی حالت میں بغیر دیکھے بھالے اُسے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ اور اُسے ڈانٹ کر کہا: تم کیوں مجھے اس طریقے سے مارتے ہو؟ ——— تم یقیناً پاگل ہو اس ملک کا ایک دستور ہے، قانون ہے، پارلیمنٹ ہے۔ اگر تم ان چیزوں کو بھول رہے ہو تو کیسے کا مزہ چکھو گے!! ——— ان دنوں میں یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ میرے ملک کے اندر انسانوں سے ایسا بھی سلوک کیا جا سکتا ہے۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور پاس کھڑے ہوئے نظر بندوں میں سے کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ اُن میں سے ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔

چند سپاہی میری طرف فوراً لپکے ——— میرے ہوش بھی ٹھکانے آگئے ——— اور یہ تلخ اور ہولناک حقیقت مجھ پر عیاں ہو گئی کہ اب میں ایسی جگہ ہوں جہاں میں کچھ نہیں کر سکتا اور اپنی ذات کے لیے کسی نفع یا نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اللہ کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے، وہ ذاتِ بزرگ و برتر جو چاہے کرے۔ سپاہی میری تکا بوٹی کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس نوجوان نے انہیں روک دیا جس نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام احمد راسخ تھا۔ جب مجھے کچھ سکون نصیب ہوا تو وہی نوجوان مجھے ہاتھ سے پکڑ کر آگے لے چلا۔ ہم راستوں اور گلیوں سے گزر رہے تھے جن کے دونوں طرف تنگ و تاریک کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ جیسے موت کے سایے لہرا رہے ہوں۔ یہ تھا اس المناک صبح کا آغاز ——— گلی کے خاتمے پر لکڑی کی سیڑھی تھی جو دوسری منزل پر جانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس نوجوان افسر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پیچھے پیچھے میں بھی سیڑھی پر چڑھ گیا۔ یہ خوفناک اور دلگداز مناظر دیکھ کر ہونٹوں پہ مہر لگ چکی تھی۔ جذبات منجمد ہو گئے تھے۔ احساس و شعور کی رگ سرد پڑ چکی تھی۔

سیڑھی ختم ہوتے ہی ایک چھوٹا سا کمرہ سامنے آیا۔ یہ کمرہ دو بڑی بیرکوں کے درمیان واقع تھا۔ ان میں سے ایک بیرک تقریباً ۲۰ میٹر لمبی اور دس میٹر چوڑی تھی۔ میں نے بائیں طرف مڑ کر دیکھا کہ بیرک میں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں ہے۔ صرف ایک لکڑی کا تخت، دو یا تین کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز جو بالعموم اسکولوں میں ہوتی ہے۔ وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ البتہ دیواریں مذھم خون کے فواروں سے رنگین تھیں۔ وہاں میں نے موت کی بو محسوس کی۔ پھر دائیں طرف جھانکنے لگا۔ احمد راسخ بھی خاموشی کے ساتھ میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر تمسخر انگیز تبسّم تھا۔ اُس نے جب مجھے دائیں جانب کی بیرک کو تکتے ہوئے دیکھا تو اپنے ہاتھ سے بیرک کے اندر موجود لوگوں کی طرف اشارہ کیا ——— یکدم میں نے شور و غل سنا۔ شدید شور و غل۔ درد و کرب سے لبریز آوازیں۔ انسانوں کی چیخیں جو درندوں کے آگے آگے دوڑتے تھے اور وہ مسلسل ان کے درپے تھے۔ اب مجھے خوف محسوس ہوا۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ ایک اور منظر۔ انسان بیرک کے طول میں گھوم گھوم کر دوڑ رہے ہیں۔ ان کے لباس اُترے ہوئے ہیں۔ بالکل مادرزاد ننگے انسان۔ ان کے ہاتھ آہنی زنجیروں میں بندھے ہیں۔ بیرک کے ہر گوشے میں تین سپاہی کھڑے ہیں۔ ہر سپاہی کے ہاتھ میں لاٹھی ہے جو اُس کے قد سے بھی زیادہ لمبی ہے۔ ان بدنصیب انسانوں پہ یہ سپاہی ان لاٹھیوں کی بارش کر رہے تھے۔ میں نے سراسیمگی اور حواس باختگی کے عالم میں احمد راسخ کو دیکھا۔ ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے مجھ سے پوچھا:

ان لوگوں میں سے کسی کو آپ جانتے ہیں؟

ہرگز نہیں!

اچھی طرح نظر ڈالیں۔

میں نے از سر نو نظر دوڑائی۔ اور یکبارگی صدمے کی وجہ سے میں زمین پہ گرا چاہتا تھا۔ فی الواقع ان بدنصیب انسانوں کے اندر تین میرے دوست تھے جنھیں میں پہلی نظر میں پہچان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ سکا تھا۔ اِس لیے کہ سب لوگ بالکل برہنہ تھے۔ احمد راسخ نے مجھے پھنکارتے ہوئے کہا:
دیکھ لیا آپ نے ملکی دستور اور ملکی قانون اور پارلیمنٹ۔ ہے اِن خرافات کی کوئی حقیقت؟
میں متشکک نگلنے لگا۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ معاملہ جواب اور دلیل سے بالاتر ہے۔
اُس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔ اِس بار اُس کی آواز زیادہ گرجدار تھی اور ہر طرف سے گونج رہی تھی۔ کہنے لگا:

آؤ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ بتاؤ؟

میں نے بے ساختہ کہا: کیا بتاؤں؟

معلوم ہوتا ہے تم کچھ تھکے ہوئے ہو۔

ہرگز نہیں۔ آپ سوال کریں۔ میں جواب دوں گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بات آپ سے چھپا کر رکھوں۔

ارے بدبخت! ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں۔

اُس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ کیا چیز ان لوگوں کو بتاؤں۔ لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے ان لوگوں سے کوئی بات نہ کی تو یہ مجھے مار مار کر ختم کر دیں گے، اور میں نے زندگی میں آج تک زدوکوب کا مزہ نہ چکھا تھا۔ صرف وہ ایک مجنونانہ تھپڑ جو احمد راسخ نے مجھے رسید کیا تھا۔ اُن دنوں وہاں انسانوں پر جو کچھ بیت رہی تھی اُس کے مقابلے میں وہ تھپڑ تو ایک معمولی بات تھی۔

احمد راسخ مجھے اُٹھا کر بیرک کی طرف لے گیا اور لکڑی کے بنچ پر بیٹھ کر مجھ سے کہنے لگا:
کہو، کیا کہتے ہو؟ میری زبان پھر خشک ہو گئی۔ میں انتہائی بدحالی اور خستگی میں مبتلا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر میری نگاہیں گڑ گئیں۔ ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہ نکل سکا۔ میں یہ نہ جانتا تھا کہ کس موضوع پر کیا کہوں۔ میں نے دبی زبان سے احمد راسخ سے کہا: کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھ سے پوچھیں اور میں آپ کے ہر سوال کا جواب دیتا جاؤں۔ اُس نے ایک خوفناک اور کرخت قہقہہ لگایا۔ اور پھر گلا پھاڑ کر جلاد کو بلایا۔ اتنا کہنا تھا کہ چار جلاد لپک پڑے۔ اُن کی آنکھوں سے غیظ آلود شرارے برس رہے تھے۔ لمحوں میں انھوں نے ویسی ہی لاٹھیاں اُٹھا رکھی تھیں جن کا میں ابھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذکر کرتا ہوں۔ اُن کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اُس کام کو بخوبی سمجھ رہے ہیں جو اُن سے کروایا جانے والا ہے۔

آدھے منٹ کے اندر میرے کپڑے اُتار کر مجھے ننگ دھڑنگ کر دیا گیا۔ تعذیب کے کولہو میں مجھے جوت دیا گیا۔ ہر طرف سے مجھ پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ گویا کمرے کی چھت لاٹھیوں اور آگ کے کوڑوں کی بارش کر رہی ہے۔ یہ ضربات مجھے اِس قدر شدید اذیت دیتیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے جسم اور میری جان کے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر ہوا میں تحلیل ہو رہے ہیں اور اُس عذاب الیم کے دھوئیں کا جزو بن رہے ہیں جس سے پوری بیرک بھری ہوئی تھی۔ خیال ہے کہ پورے ایک گھنٹے تک تندو کرب کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ گھنٹہ بھی میرے لیے صدیوں سے کم نہ تھا۔ خستہ و درماندہ زمین پہ گر گیا۔ ایک بے جان لاشہ۔ بایں ہمہ سپاہیوں نے مجھے نہ چھوڑا۔ اپنی لاٹھیاں اور تازیانے لے کر میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور مجھے مارنے لگے ـ ـ ـ ـ ـ ـ بالکل اس طرح جیسے قصاب ذبح شدہ دُنبے کو لٹکا کر اُس میں ہوا بھرتا ہے اور پھر اُسے ڈنڈے سے مارتا ہے تاکہ آسانی سے اُس کی کھال اُتاری جاسکے۔

ہماری کھال اُتارنے کا یہ فعل انٹیلی جنس والوں کی اصطلاح میں "تحقیق و تفتیش" تھا۔ چند لمحات گزرے ہوں گے کہ احمد راسخ نمودار ہوا۔ اُس کے کشادہ قدموں کے سامنے تعذیب کے آلات دیکھ رہا تھا جنہیں وہ گھسیٹ کر لا رہا تھا۔ ان آلات سے جو جھنکار اُٹھ رہی تھی وہ جری سے جری انسان کے بدن میں بھی جھرجھری پیدا کر دینے والی تھی۔ وہ بڑی درندگی اور سنگدلی کے ساتھ مجھ سے کہنے لگا:

آؤ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ بتاؤ۔

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے مزید کہا: فیلڈ مارشل نے ہمیں اجازت دے دی ہے کہ تم میں سے پچاس کتوں کو ہم مارنا چاہیں تو مار ڈالیں۔

میرا ذہن غبار آلود ہو گیا۔ لیکن میں نے اپنے بدن کے اندر ایک لذیذ مستی سرایت کرتی ہوئی محسوس کی۔ سوچا لو اب چھٹکارا قریب تر ہو گیا ہے۔ چند لمحوں کی بات ہے۔ یہ انسان نما درندہ مخلوق میرے قتل کا فیصلہ کرے گی اور میں انہیں پاؤں سے مسلتا ہوا اللہ تعالیٰ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وسیع بارگاہ میں پہنچ جاؤں گا - سوچ کے چند حیرت انگیز لمحات مجھ پر طاری ہو گئے - کیا جب میں مر جاؤں گا تو شہادت نصیب ہو گی ؟ میں ان پاکیزہ و بلند خیالات میں محو تھا کہ تعذیب کا سلسلہ شروع ہو گیا - یہ مار پیٹ کا نیا دَور تھا - مگر اب زیادہ درندگی اور وحشتناکی کا مظاہرہ کیا گیا - میں جان لیوا ضربات کے اندر اُس سے کہہ رہا تھا : مجھے بتا تو دو کہ کس موضوع کے بارے میں تم چاہتے ہو کہ میں بات کروں ؟ اُس نے ایک لفظ کہا جس سے بات کا راستہ کچھ واضح ہوا - مگر وہ لفظ سُنتے ہی مجھے تاریکی نے پھر دبوچ لیا - وہ ایک ہی لفظ تھا - مگر اس میں تیزی تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تھی - وہ تھا : " اخوان المسلمون " میں نے حیرت کے ساتھ اُس سے کہا : اخوان المسلمون کی کونسی بات کے بارے میں کہوں ؟ اُس نے کہا " اُن کی تنظیمیں - سازشیں - ہتھیار - ٹریننگ دینے والے ہر چیز کے بارے میں بتاؤ " ———— یہ کہا اور پھر زد و کوب بڑی سخت ، تُند اور رُوح فرسا -

اس حالت میں کتنا وقت گزرا - میں کچھ نہیں جانتا - مجھ پر غنودگی چھائی رہی - جب ہوش آیا تو یوں محسوس ہوا کہ میں عالمِ خواب میں ہوں - دن آدھا گزر چکا تھا - احمد راسخ بیرک سے جا چکا تھا - دوسرے متعدد فوجی افسر آ چکے تھے - سپاہی اُسی طرح کے ڈیسک لے آئے جو اسکول کی کلاسوں میں ہوتے ہیں - ہر فوجی افسر بیرک کے ایک کونے میں جا بیٹھا - میرے جیسے دوسرے نظر بندوں کو ایک ایک فوجی افسر کے سامنے پیش کیا جاتا رہا - مجھے انہوں نے کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیا -

یہ نازک اور جان گسل دن گزرنے سے پیشتر ہی میں " تحقیقات کی کارروائی " کے دوران اصل کہانی سمجھ چکا تھا - فوجی افسر اُن ملزموں سے یقین کئے بیٹھے تھے کہ اخوان المسلمون نے ضرور کوئی سازش تیار کی ہے - مگر ملزم بے خودی اور وارفتگی کی حالت میں مبتلا تھے - یہ سب لوگ گو اخوان المسلمون کے ارکان تھے مگر انہیں فوجی افسروں کی یقین دہانی کے باوجود اس امر کا قطعاً علم نہ تھا کہ اخوان نے جمال عبدالناصر کی حکومت کے خلاف کوئی سازش تیار کی ہے اور شمس بدران (سابق وزیر جنگ) کی سرپرستی میں ملٹری انٹیلی جنس نے اسے بروقت پکڑ لیا ہے - خود سول انٹیلی جنس کو ایسی کسی سازش کا کوئی علم نہیں تھا - یہ معاملہ بنیادی طور پر ملٹری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انٹیلی جنس کی نگرانی میں تھا۔ اور جنگی جیل کے اندر اصل تحقیقاتی کارروائی کی جارہی تھی۔ ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ اس بات کی اجازت نہ دیتے تھے کہ اس کہانی کے بارے میں کسی قسم کی معلومات سول انٹیلی جنس کے افسران تک پہنچ جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سول انٹیلی جنس کے لوگ بھی ہر ایرے غیرے کو پکڑ لیں اور اس معاملے کے بارے میں وہ بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔

اُن دنوں فوج کی کریمنل انٹیلی جنس کا شعبہ مصر کا اصل حکمراں ادارہ تھا۔ اُس کے فیصلے قضاء اور قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ مصری عدلیہ کے فیصلوں کو چیلنج کیا جاسکتا تھا اور اُس کے احکام کو رد کیا جاسکتا تھا، مگر اِس شعبے کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس شعبے کا سربراہ بریگیڈیر سعد زغلول عبدالکریم تھا جو براہ راست شمس بدران کے ماتحت تھا۔ شمس بدران فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر کے دفتر کا انچارج تھا، اور چونکہ عبدالحکیم عامر شدید ذمہ داریوں کے اندر دبا ہوا تھا، اس لیے اُس نے تمام اختیارات اپنے دفتر کے انچارج کو دے رکھے تھے تاکہ وہ مصر کی "بہبود و فلاح" کے لیے جو مناسب اقدام ہو کرتا رہے۔ یہ شخص بالکل مطلق العنان تھا۔ خلقِ خدا کے ساتھ جو سلوک چاہتا تھا کرتا تھا۔ عبدالحکیم عامر کی طرف رجوع کرنے یا اُس سے کوئی بات دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

بیرک کے فوجی افسروں کے پاس ایک ایک شخص کو تحقیقات کے لیے بلایا جاتا اور اُسے اس قدر مارا جاتا کہ وہ حواس کھو بیٹھتا۔ وہ کچھ بات بھی نہ کرسکتا تھا کیونکہ اُسے کہانی ہی سرے سے معلوم نہ تھی۔ پھر دوسرا شخص لایا جاتا اور اس کے سامنے بھی یہی داستان دُہرائی جاتی۔ پھر تیسرا...... پھر چوتھا.....

سپاہی لوگوں کو بہت شدت کے ساتھ مارتے تھے یہاں تک کہ لوگ یہ اقرار کرلیتے کہ وہ واقعی مجرم ہیں۔ تحقیقاتی افسر صرف اس بات پہ اکتفا نہ کرتا کہ کسی شخص نے اقرارِ جرم کرلیا ہے۔ بلکہ اُس شخص کا یہ فرض تھا کہ وہ تحقیقاتی افسر کو اپنے مُجرم ہونے کا پوری طرح قائل کرے اور جو جھوٹی باتیں وہ اپنے آپ کی طرف منسوب کر رہا ہے اُن میں اگر کوئی خامی یا خلاء رہ گیا ہے تو اُسے اچھی طرح پُر کرے۔ اُس خون آشام دن میں مَیں نے وہاں جو کہانیاں خود سُنیں اور جو میرے سامنے روایت کی گئیں ان میں سے ایک کہانی "چاول کی بوری" کے عنوان سے مشہور ہوئی۔ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہانی یہ تھی :

مصلح زریق نامی مزدور ایک ایسی کمپنی میں مزدوری کرتا تھا جو ملک کے مختلف حصوں میں سڑکیں پختہ کرنے کا کام کرتی ہے ۔ ۱۹۶۰ء کی بات ہے یہ کمپنی دمیاط شہر کے قریب کسی سڑک کو پختہ کر رہی تھی ۔ یہ پورا علاقہ اچھی قسم کے چاول پیدا کرنے میں شہرت رکھتا ہے مصلح زریق جب اپنے کام سے فارغ ہوا اور قاہرہ واپس لوٹنے لگا تو اُس نے اپنے ایک ساتھی احمد السید اسماعیل کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قریبی قصبہ جس کا نام کفر البطیخ ہے سے گزرتے چلیں ۔ وہاں چاولوں کا ایک تاجر رہتا ہے عبدالفتاح اسماعیل ۔ اسی حیثیت سے وہ مشہور تھا ۔ عبدالفتاح اسماعیل اخوان المسلمون کی تیسری نسل کے لیڈروں میں سے تھا ۔ مسکین مصلح زریق کے ذہن سے یہ پہلو اوجھل ہو گیا ۔ مصلح اور اس کا ساتھی احمد السید اسماعیل کفر البطیخ کی طرف چل دیے تاکہ دمیاط کے اعلیٰ قسم کے چاولوں کی ایک بوری خرید سکیں ۔ اگر ان دونوں انسانوں کو یہ خبر ہوتی کہ اس شوق کے سبب اُن پر کیا وبال ٹوٹنے والا ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ پر چاول حرام کر لیتے بلکہ اپنے بعد آنے والی نسلوں پر بھی قیامت تک چاول حرام ٹھیرا دیتے ۔

دونوں ساتھی کفر البطیخ پہنچ گئے اور عبدالفتاح اسماعیل کا پتہ دریافت کرنے لگے شومیٔ قسمت کہیے یا تقدیر کہ وہ دونوں انٹیلی جنس کے کسی کارندے سے ملے جو اتفاق سے انہیں راہ چلتے مل گیا ۔ اُس سے وہ عبدالفتاح اسماعیل کا پتہ ابھی پوچھنے نہ پائے تھے کہ اس نے دونوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی ۔ اور اُن سے شناختی کارڈ لے کر اُن کے نام ڈائری میں نوٹ کرنے شروع کر دیے ۔ پھر ان کی آمد کا سبب پوچھ کر انہیں نصیحت کی کہ وہ واپس لوٹ جائیں اور آئندہ اس بستی میں نہ آئیں ۔ انٹیلی جنس کے کارندے نے اس کی رپورٹ لکھی اور اپنے دفتر کو پیش کر دی ۔ چونکہ یہ واقعہ معمولی اور ہیچ تھا اس لیے اس رپورٹ پر دھیان دینے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی ۔ البتہ عبدالفتاح اسماعیل کی فائل میں اُسے منتقل کر دیا گیا ۔ مصلح اور احمد السید اسماعیل اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے اور پھر یہ بات بھی نسیاً منسیاً ہو گئی ۔

کئی سال گزر گئے ۔ ۱۹۶۵ء کا سال آگیا ۔ عبدالفتاح اسماعیل گرفتار کر لیا گیا ۔ اور تحقیقاتی کارروائی کے لیے اُسے جنگی جیل میں بند کر دیا گیا ، یعنی ملٹری انٹیلی جنس کے پاس ۔ سول انٹیلی جنس ، جو اِس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوری کہانی سے بے خبر تھی۔ آخر کار جب اُس کے علم میں یہ مسئلہ آیا تو اُس نے بھی اس کا مطالعہ اور تحقیق شروع کر دی۔ عبدالفتاح اسماعیل کی فائل میں منسلکہ رپورٹوں کے اندر جن لوگوں کے نام درج تھے اُن سب کو گرفتار کر کے اُن کے خلاف تحقیقات شروع کر دی۔ مصلح اور اس کے ساتھی پر بھی وہ گھڑی آوارد ہوئی جو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی۔ یہ دونوں بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ فوجی افسران یہ کوشش کرتے رہے کہ مصلح زریق یہ بتائے کہ چند سال پیشتر کفر البطیخ جا کر وہ عبدالفتاح اسماعیل کو کیوں تلاش کر رہا تھا؟ وہ کیا راز تھا؟...... مسکین بالکل آسان اور سیدھا سادھا سا جواب دے دیتا تھا کہ وہ اور اُس کا ساتھی دمیاط کے چاول خریدنے کے لیے گئے تھے۔ مگر اُس کا یہ جواب اُس کے عذاب میں کمی کے بجائے اضافہ کر دیتا۔ اس مسکین کے سر پر عذاب واذیت کی آگ کی بارش کی گئی۔ کبھی لاٹھیوں کی بارش ہوتی۔ کبھی نوبہ کے علاقے یا سوڈان کے گندھے ہوئے تازیانوں کی۔ مصلح مسکین بڑی چیخیں مارتا۔ اُس کی زبان سے مختلف الفاظ نکلتے، کچھ بامعنی اور کچھ بے معنی، جو ایسی زبان سے تعلق رکھتے جنھیں انسانی مخلوق نہیں سمجھتی۔ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (ہر طرف سے موت اُس پر حملہ کرتی مگر وہ نہ مر پاتا)۔

جب جلاد تعذیب کی کارروائی سے ہانپ جاتا اور کچھ سستانے لگتا تو مصلح بلند آواز سے واویلا کرتا: خدائے عظیم کی قسم ہم نے صرف چاول خریدنے کی خاطر عبدالفتاح اسماعیل کا پتہ پوچھا تھا۔ حضور، ہم صرف ایک بوری چاولوں کے لیے وہاں گئے تھے۔ مگر فوجی افسر نے اُسے جواب دیا: کتے کے بچے! چاولوں کی بوری کے لیے گئے تھے یا ہتھیاروں کی بوری کے لیے؟ مصلح زریق نے جب یہ جواب سُنا تو اُسے عذاب سے جان چھڑانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ پورے زور سے چیخا گویا اُس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔

"حضور آپ نے کیا فرمایا؟ ہتھیاروں کی بوری؟ جی...... جی...... ہم جب کفر البطیخ گئے تھے تو یہی چیز ہمارے پیش نظر تھی۔ حقیقت بہرحال کھل کر ہی رہتی ہے۔ ہم ہتھیاروں کی بوری کی خاطر وہاں گئے تھے۔ ہاں بے شک ہمیں ہتھیاروں کی بوری چاہیے تھی"۔ مصلح اس حالت جنون میں ہنس بھی دیا۔ تعذیب کا کولہو رُک گیا۔ تحقیقاتی کارروائی کا رُخ بھی بدل گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب وہ دوسرے رُخ پر چل پڑی ۔ عجب ستم ظریفی دیکھنے میں آئی ۔

یہ المیہ بھی تھا اور طربیہ بھی ۔ یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ المیہ تھا یا طربیہ ۔ مصلح کی بیڑیاں کھول دی گئیں ۔ عذاب بھی ختم کر دیا گیا ۔ کیونکہ اُس نے تسلیم کر لیا کہ اُس نے ہتھیاروں کی ایک بوری کفر البطیخ سے کسی اور جگہ منتقل کی تھی ۔ احمد السید اسماعیل نے بھی مصلح کی روایت کی بڑے جوش و جنون کے ساتھ توثیق کر دی ۔ دونوں کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ اس کہانی کی توثیق کرنا پسند کرتے ہیں یا موت !

وزارتِ داخلہ میں تبدیلی آچکی تھی ۔ سول انٹیلی جنس بھی حرکت میں آگئی تھی ۔ قلعہ کی جیل میں کرنل احمد صالح داؤد آیا جو سول انٹیلی جنس کا رکن رکین سمجھا جاتا تھا ۔ وہ بذات خود تحقیقات کی نگرانی کے لیے آیا ۔ مصلح کے لیے اب یہ ناگزیر ہو گیا کہ وہ ان ہتھیاروں کا پتہ بتائے جن کے بارے میں اُس نے اعتراف کر لیا ہے — جھوٹا اعتراف — کہ وہ اُس نے کفر البطیخ سے باہر منتقل کیے ہیں ۔ مصلح نے فوری طور پر اُس کا جواب بھی سوچ لیا ۔ یہ قضیہ چونکہ اخوان المسلمون سے متعلق ہے لہٰذا یہ ہتھیار بھی ان کے قبضے میں ہی ہونے چاہییں ۔ اُس کے ذہن میں اخوان کے دو آدمی آگئے جو اُس کے محلے میں رہتے تھے ۔ اور یہ دونوں ابھی ابھی ۱۹۶۴ء میں جیل سے رہا ہوئے تھے ۔ ایک احمد شعلان اور دوسرا زکریا المشتولی — ہم تیسرے کا بھی ذکر کیے دیتے ہیں ۔ بدر القصبی ۔ اللہ تعالیٰ ان تینوں پر اپنی رحمت و مغفرت کی بارش برسائے ۔

مصلح نے بیان دیا کہ ہتھیار ان تینوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو دیے گئے ہیں ۔ پوری طرح یاد نہیں ہے ۔ چنانچہ ان تینوں کو فیوم جیل سے یہاں قلعہ میں لایا گیا ۔ اور ان تینوں کو بڑی زہرہ گداز اور بہیمانہ تعذیب دی گئی — تینوں اسی تعذیب میں شہید کر دیے گئے ۔ ان میں سے ایک زکریا المشتولی کی لاش کو خود میں نے اُٹھایا ۔ خدا اُس پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے یہ تینوں مار مار کر شہید کر دیے گئے مگر انہیں تادم آخریں ہتھیاروں کی بوری کا نشان معلوم نہ ہو سکا ۔ وہ اس کہانی سے بالکل بے خبر تھے ۔

جیل والوں کا طریقہ یہ تھا کہ جو نظر بند تعذیب سے مر جاتا کاغذات میں اُس کے نام کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آگے "مفرور" کا لفظ لکھ دیا جاتا۔ جیل کا ریکارڈ جب پولیس والوں کو پہنچتا تو وہ لوگ "مفرور" کے گھر پر جا چھاپہ مارتے، گھر کا ساز و سامان توڑ پھوڑ دیتے، پورے گھر میں تباہی مچا دیتے، جو ملتا اُسے زدوکوب کرنے لگتے۔ بعض اوقات گھر کے مردوں اور عورتوں تک کو جیل میں لے آتے۔ اس الزام میں کہ ان لوگوں نے "مفرور" کو بھاگنے میں مدد دی ہے ——— اور "مفرور" بے چارا زندگی کی آزمائشوں اور بوجھوں سے نجات حاصل کر کے اپنے رب کے حضور پہنچ چکا ہوتا تھا۔ رہا مصلح زریق، تو وہ اور اس کا ساتھی قلعہ سے جنگی جیل بھیج دیے گئے۔ وہاں ملٹری انٹیلی جنس کے افسروں نے ——— جو مصر کے اصل اصحاب اقتدار و ارباب جاہ تھے ——— چند روز کے بعد ہی ان دونوں کو رہا کر دیا۔

میں وہ تاریخی لمحات نہیں بھول سکتا جب میں قلعہ میں ایک مرتبہ یہ دیکھ کر کہ نگران فوجی افسر دوپہر کے کھانے کے لیے چلا گیا ہے مصلح زریق کے قریب ہو گیا اور اُس سے کہا:

جو بات ابھی ابھی تمھارے منہ سے نکلی ہے (یعنی "اقبال جرم") اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غلط ہے۔ لیکن یہ بھی امکان ہے کہ یہ بیان تمھیں لیمان طرہ کی جیل میں پہنچا دے۔

مصلح نے بھٹکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا: آپ کا کیا مطلب؟

میں نے ازراہ تعجب اُس سے کہا: تمھارا "اقبال جرم" ۲۵ سال قید بامشقت سے عبارت ہے۔

اب اُس نے مجھے ذرا سنجیدہ اور خوف سے لرزتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پوچھا، "وضاحت سے بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں"۔

میں نے کہا: جب یہ واقعہ ہی پیش نہیں آیا (یعنی چاولوں کی بوری کے بجائے ہتھیاروں کی بوری وصول کرنے کا) تو تمھیں لازماً اپنے بیان سے رجوع کرنا پڑے گا۔

اُس کی نگاہیں جو خوف و ہراس سے لبریز تھیں، اب وہ حقارت کا پیکر بن گئیں۔ اس نے مجھے باآواز بلند کہا: آپ بیوقوف معلوم ہوتے ہیں۔

میں؟

جی ہاں! خدا کی قسم۔ اگر "اقبالِ جرم" کی پاداش میں مجھے دو سو پچاس سال بھی جیل میں ڈال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا جائے تو میں اپنے بیان سے سرِ مُو بھی انحراف نہ کروں گا!!

میں نے اُسے کہا: اچھا تو کیا تو مجھے یہ اجازت دے گا کہ میں فوجی افسر کو اصل واقعہ سمجھا دوں (یعنی یہ کہ ہتھیاروں کی بوری وصول کرنے کا قصہ جھوٹ ہے) - ؟

وہ یہ سُن کر بے تحاشا رونے لگا - اور مجھے خدا کا واسطہ دے کر کہنے لگا کہ میں ایسی کوئی بات افسروں سے نہ کہوں ——— اور آخر مجھے ان افسروں سے بات بھی کیا کرنی تھی - میں خود مصائب و شدائد اور آفات و بلیات کے نرغے میں تھا -

میری اور مصلح کی گفتگو یکدم منقطع ہو گئی - کیونکہ جیل کے افسر واپس آ گئے - اب اُن کے پیٹ طعام و شراب سے پُر تھے - اور مظلوم قیدیوں کو تعذیب کی وجہ سے جو طاقت وہ کھو چکے تھے وہ اب عود کر چکی تھی -

جو باتیں قابلِ ذکر ہیں اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ ان دنوں احمد صالح داؤد فوجی افسروں سے ملاقات کے لیے قلعہ آیا تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ تحقیقات کی رفتار کیا ہے اور ان کا رُخ کدھر ہے - طویل اجتماع کے بعد، احمد صالح داؤد جیل کے صحن میں ایک افسر کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا - مجھے جہاں عذاب دیا جا رہا تھا یہ جگہ وہاں سے صرف چند میٹر کے فاصلے پر تھی - میں نے احمد صالح داؤد کو یہ کہتے سُنا: "دوستو، یہ لازماً پیشِ نظر رکھو کہ ایک ایسی تنظیم ضرور پائی جاتی ہے جس میں اخوان المسلمون کے تمام افراد شامل ہیں"- دوسرے فوجی افسر نے اُسے جواب دیا: "پاشا صاحب! اب تک تحقیقات کے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اُن سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی"- پاشا صاحب نے تُندی کے ساتھ اُسے ٹوکتے ہوئے کہا: "صدر صاحب فرماتے ہیں: ملک میں ایسی تنظیم ضرور پائی جاتی ہے - ایسی تنظیم ہونی چاہیے - سمجھے آپ - اِسی نہج پر تفتیش جاری رہنی چاہیے - تم لوگوں کے حوصلے کہاں گئے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض نظر بند ابھی تک پاؤں کے بل چل پھر رہے ہیں"-

احمد صالح داؤد کے دورہ کے بعد تعذیب کی مردافگن چکی پھر چل پڑی، جو افسروں کی باہم ملاقات کے دوران کچھ دیر کے لیے رُک گئی تھی - اب اس چکّی کی سنگینی اور درندگی اور زیادہ بڑھ گئی تھی تاکہ آئندہ کوئی پاؤں کے بل بھی نہ چل سکے - یہ لوگ تمام نظر بندوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے پر

(دیکھیے صفحہ ۴۴)

© rasailojaraid.com